علی گڑھ تحریک: اغراض ومقاصد

امتیاز عبدالقادر
ریسرچ اسکالر اردو، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

ALI GARH MOVEMENT
ITS AIMS AND OBJECTIVES

Imteyaz Abdul Qadir
Research Scholar of Urdu
Kashmir University, Srinagar

Abstract

Sir Syed Ahmad Khan was a true well wisher of the Muslims of the Sub-continent. He served his nation in multiple ways but his main claim to fame was his initiative of Ali Garh Movement. Though this movement was basically meant for educating the Muslims of the Sub-continent yet it also proved to be a watershed in the political sphere of the Sub-continent. Sir Syed dedicated all his energies for the success of his movement. The role of this movement has also been very crucial in the Pakistan Movement. This article highlights the aims and objective of Ali Garh Movement.

Keywords:

سرسید، مسٹر کارگل، محمد اسماعیل شہید، رشید احمد صدیقی، حیدرآباد، میسور، اودھ، علی گڑھ تحریک، شعرالعجم، اردو ادب کی تاریخیں، حیات جاوید

انیسویں صدی کا آغاز ہوا تو ہندوستان میں معاشرتی اور سیاسی زندگی کی رفتار یک دم تیز ہوگئی۔ مغلوں کے زوال کے بعد جس نئی سیاسی قوت نے غلبہ حاصل کیا وہ نہ مسلمانوں سے متعلق تھی نہ ہندوؤں سے، بلکہ وہ انگریز کی تحویل میں تھی۔ یہ قوت ایسی تھی جس کے اغراض و مقاصد ابتداً تجارتی تھے لیکن بعد میں اس نے جہانداری اور ملوکیت کا خواب بھی دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ حیدرآباد، میسور اور اودھ پر تسلط جما لینے کے بعد انگریز عملی طور پر ہندوستان کے بہت سے علاقے کو محکوم بنا چکے تھے اور اب وسطی ہند میں مرہٹوں، پنجاب میں سکھوں اور سندھ میں امیرانِ سندھ کو زیر نگین بنانے اور تاجری کو تاجوری میں تبدیل کرنے کے منصوبوں پر غور کر رہے تھے۔ انگریزوں کی اس فتح یابی نے فکر و نظر کی مغربی رَو کو پنپنے، پھیلنے اور پھر غلبہ پانے کا موقعہ دیا۔ اقتدار کی سیاسی قوت چونکہ انگریزوں کے ہاتھ میں تھی اس لیے معاشی، معاشرتی اور سیاسی مطلع پر اس قوت نے زیادہ اثرات ثبت کیے۔ سید احمد بریلوی نے مسلمان قوم کے جذبہ جہاد کو متحرک کیا۔ دیانند سرسوتی نے قدیم آریائی سماج کے احیا کی کوشش کی جبکہ راجا رام موہن رائے اور سرسید احمد خان نے اپنی آنکھیں مستقبل کی طرف کھولیں۔ نئے نظریات، افکار اور علوم کو قبول کرنے کے لیے تصادم سے گریز اختیار کیا اور قوم کو نئی روشنی قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس زمانے میں برہمو سماج، آریا سماج، تحریک سید احمد بریلوی، تحریک دہلی کالج اور علی گڑھ تحریک اُبھریں جو فکری لحاظ سے زیادہ اہم تھیں۔ ان میں سے چند تحریکوں نے رزم آرائی کی کوشش کی جبکہ دوسری بیشتر تحریکوں نے کشور کشائی کے برعکس قلوب مردہ میں تحرک پیدا کیا اور محکومی کے جذبات کو ذہنی آزادی سے مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سرسید احمد خان کی تحریک اس لیے اہم ہے کہ اس کا آغاز محکومی کا دائرہ مکمل ہو جانے کے بعد ہوا اور اس تحریک نے مسلمانوں کا جمود اور غلامی کا حصار توڑ کر مستقبل کی تعمیر کی ذمہ داری قبول کی۔ اس لحاظ سے علی گڑھ تحریک مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی فکری تحریک تھی اور اس کے ماخذات و محرکات میں مندرجہ بالا تحریکوں کے علاوہ دورِ گزشتہ کے عوامل بھی شامل تھے۔(۱)

سرسید کی شخصیت اور تحریک نزاعی تھی۔ وہ اپنے عہد کا ردِعمل بھی تھی اور مستقبل کے لیے اشاریہ بھی اس لیے سرسید تحریک کا ۱۸۵۷ء کے بعد ملکی حالات اور سیاسی پسِ منظر میں جائزہ لینا ضروری ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مسلمانوں کی ہزیمت اور برطانوی تسلط پر منتج ہوئی۔ مسلمانوں کو اس انقلاب میں جان و مال اور عزت و ناموس ہی کی قربانیاں نہیں دینی پڑی بلکہ اب سفید سامراج کے روپ میں قدیم تہذیب اور اسلامی تمدن کی موت بھی نظر آ رہی تھی۔ اس پرآشوب عہد میں جبکہ مسلم آبادی کا کثیر حصہ احساس شکست کی بنا پر دروں بینی، انفعالیت اور قومی سطح پر احساس کمتری کا شکار تھا، معاشرہ گدلے پانی کے جوہڑ جیسی صورت اختیار کر گیا۔ سرسید کا عقلی علوم کے ساتھ ساتھ تاریخ کا گہرا مطالعہ تھا، اسی لیے انھوں نے تاریخ کے اس فیصلہ کو صحیح جانا کہ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ تاریخ کا تقاضا ہی نہیں بلکہ اس تاریخی انقلاب کے نتائج سے انکار کرنا تاریخی حقائق سے روگردانی کے

مترادف ہے۔انھوں نے سستی جذباتیت سے ہٹ کر حالات کا ایک سائنس دان کی طرح غیر جانبداری سے تجزیہ ہی نہ کیا بلکہ غلط قسم کی مذہبی روایات، کہنہ مسلّمات اور فرسودہ شعائر سے پیدا ہونے والی ذہنی گھٹن میں عقلیت کے چراغ فروزاں کیے۔(۲)

۱۸۵۷ء کا انقلاب بہت بڑا طوفان تھا لیکن سرسید تحریک بھی کسی طوفان سے کم ثابت نہ ہوئی۔یہ ایسا طوفان تھا جس نے مسلم سماج کے تمام طبقات میں خیالات کی حیات بخش رو دوڑا دی۔قدیم تصورات اور فرسودہ عقائد خس وخاشاک کی طرح اڑائے اور آنے والے عصر کے لیے انداز نو کی نوید بھی دی۔

سرسید احمد خان سقوط دہلی سے قبل علمی، ادبی، سیاسی اور تہذیبی حلقوں میں متعارف ہو چکے تھے۔ انھوں نے رفاہِ عامہ کے امور اور تصنیف وتالیف کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔چنانچہ ۱۸۴۱ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک انھوں نے پندرہ کتابیں تالیف کیں۔ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کو مذہب اور تاریخ سے یکساں دلچسپی تھی اور ان کا تفکر، سائنسی اندازِ نظر اور علوم مفیدہ کی ترویج کے لیے کوشاں تھا۔سرسید کی شخصیت میں قدامت اور جدیدیت دونوں کا امتزاج موجود تھا۔انھوں نے مسلمانوں کے روشن ماضی سے عظمت ورفعت کا تصور حاصل کیا لیکن اس تصور میں رنگ آمیزی مغربی علوم سے کی۔چنانچہ ان کی شخصیت سے ایک ایسی تحریک پھوٹی جس نے اسلامیانِ ہند کو اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس دلا دیا۔(۳)

سرسید کی مزاج سازی میں دلی کالج کی علمی تحریک نے بھی اہم کردار ادا کیا۔دلی کے قیام کے دوران اس کالج کی چند سربرآوردہ شخصیتوں سے سرسید کا رشتہ محبت استوار ہوا اور انھوں نے ڈاکٹر اسپرنگر اور مسٹر کارگل سے مسائل کے سائنسی تجزیے اور تصنیف وتالیف کے نئے انداز سیکھے۔سائنٹفک سوسائٹی کا قیام اور مفید انگریزی کتب کے تراجم وغیرہ چند ایسے اقدام ہیں جن میں دلی کالج کی سابقہ مثالوں پر ہی عمل کیا گیا ہے۔نذیر احمد دہلوی نے دلی کالج کو آزادیِ رائے، اجتہاد، بصیرت اور ریشنلزم کا ادارہ کہا ہے۔سرسید اس کالج کے طالب علم نہیں تھے تاہم اختلاف کو قبول کرنے اور اپنی رائے کو بصیرت سے منوانے کا جوہر ان میں موجود تھا۔ان کی افزائش دلی کالج کی صحبتوں کا نتیجہ نظر آتی ہے۔

انگریزی کی یورش نے قدیم اور جدید کے درمیان تصادم کی فضا پیدا کر دی تھی اور یوں ہندوستان کی تہذیبی زندگی، قومی ہیئت اور ملکی حالات کو پیچیدہ مسائل سے دوچار کر دیا۔سائنٹفک سوسائٹی نے رائے عامہ ہموار کرنے اور قدامت کو جدیدیت سے مغلوب کرنے کی سعی کی اور حصول مقصد کے لیے 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کا اجرا کیا۔یہ اخبار اگرچہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے مابین باہمی روشناسی کا وسیلہ تھا تاہم اس کا مجموعی مزاج علی گڑھ تحریک کے ساتھ مطابقت رکھتا تھا۔اس نے مسلمانوں میں سیاسی، تہذیبی اور ادبی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

انگریزی کتب کے تراجم نے علوم وفنون کو جو ترقی دی تھی اس نے سرسیدؔ کے ذہن میں 'ورنا کیولر یونیورسٹی' قائم کرنے اور انگریزی کے ساتھ دیسی زبانوں کو متمول بنانے کی تحریک پیدا کی۔ چنانچہ سرسیدؔ نے یکم اگست ۱۸۶۷ء کو گورنر جنرل کو جو عرضداشت بھیجی اس میں مطالبہ کیا:

ا۔اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لیے ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جہاں علوم وفنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہو۔

ب۔وہ تمام علوم جن کا امتحان کلکتہ یونیورسٹی انگریزی میں لیتی ہے، یہ سررشتہ دیسی زبان میں لے اور طلبہ کو یکساں معیار کی سندیں عطا ہوں۔

اس منصوبے کی تکمیل کے لیے سرسید نے پیشکش کی کہ انگریزی سے اردو میں تراجم کا کام سائنٹفک سوسائٹی انجام دے گی۔(۴) سرسید کی یہ تجویز بقول حالیؔ اس وجہ سے کامیاب نہ ہوسکی کہ اس سے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے متاثر ہونے کا خطرہ تھا اور سرسیدؔ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان اس سے محروم رہے۔سرسید علی گڑھ تحریک کا پس منظر بھی تھے اور پیش منظر بھی۔علی گڑھ تحریک کا خاکہ ان کے تفکر کا اور اس کا ارتقا ان کے تدبر کا نتیجہ تھا۔ اس خاکے میں رنگ آمیزی سرسید کے خلوص عمل اور حسنِ نیت نے کی۔ چنانچہ جس طرح سرسید کی شخصیت اور ان کے تعمیری کام متنازعہ فیہ ہیں، اسی طرح علی گڑھ تحریک کے مقاصد پر بھی سب اہل الرائے متفق نہیں۔ سید احتشام حسینؔ کے بقول ''اس تحریک کے اساسی پہلوؤں میں نئے علوم کا حصول، مذہب کی علومِ عقلی سے تفہیم، سماجی اصلاح اور زبان وادب کی ترقی اور سربلندی شامل ہیں''۔(۵) رشید احمد صدیقی نے مذہب، اردو، ہندو ومسلم تعلقات، انگریزی اور انگریزی حکومت، انگریزی زبان، مغرب کا اثر اور تقاضے وغیرہ چند پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے جو ہمیشہ معرض بحث رہے۔ڈاکٹر انور سدیدؔ کے خیال میں علی گڑھ تحریک کا اہم ترین مقصد ہندوؤں اور انگریزوں کی سیاسی مفاہمت کے دور میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا احیا اور نئے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کی ترقی، بقا اور سربلندی کے لیے مثبت راستے کا تعین تھا۔(۶) اسلام چونکہ مسلمانوں کا دین تھا اور عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجی مبلغوں نے وسیع پیمانے پر اہل ہند کو تبدیلیِ مذہب پر آمادہ کرنا شروع کر دیا تھا، اس لیے سرسید نے اسلام کی تفہیم وترویج کو بھی اساسی اہمیت دی۔سرسیدؔ کے عہد میں ہندوؤں نے ہندی زبان کی سرپرستی فرقہ وارانہ بنیادوں پر شروع کر دی تھی اس لیے اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا گیا اور اس کے استیصال کے لیے سیاسی سطح پر محاذ آرائی ہوئی۔سرسید نے اردو کی اس نئی حیثیت کو قبول کیا اور ہند اسلامی تہذیب کے اس شیریں ثمر کو تحفظ پہنچانے کی جدوجہد شروع کر دی۔چنانچہ علی گڑھ تحریک کو وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو اس کے مقاصد کی توضیح مندرجہ ذیل تین زاویوں سے ہوتی ہے:

اول سیاسی زاویہ: مسلمانوں کی تہذیبی بقا، سیاسی ترقی اور معاشرتی سربلندی

دوم مذہبی زاویہ: نئے علوم کی روشنی میں دین کی توضیح وتشریح اور اوہام پرستی کا ازالہ

سوم ادبی زاویہ: اردو زبان وادب کا فروغ (۷)

انگریزوں سے پہلے کے مسلمانوں نے برصغیر میں فرد کی شخصیت کو مجروح نہیں کیا تھا بلکہ پیوند کاری کے عمل سے اجتماعی شخصیت میں نئے گوشے پیدا کیے۔ انگریزوں نے پہلی مرتبہ اس احساس کو بیدار کیا کہ ہندوستان میں ایک کے بجائے دو قومیں آباد ہیں اور سیاسی میدان میں ہندوؤں کو آگے بڑھانے کے مواقع پیدا کیے۔ دوسری طرف مسلمان قوم کی مکمل شخصیت کو جس میں مذہب، سیاست اور ادب کے تینوں زاویے موجود تھے، بانٹنے کے لیے دین اور دنیا میں خلیج پیدا کر دی۔ انیسویں صدی کی سیاسی کشمکش میں اس بات کو بھی اہمیت حاصل ہے کہ مذہبی مدارس اور جدید مدارس کی تعلیم یک رخی تھی۔ چنانچہ اول الذکر نے نئے علوم کو حاصل کرنا گناہ تصور کیا اور موخر الذکر نے مذہب کے روحانی عنصر سے روگردانی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمان کی شخصیت میں خلا پیدا ہو گیا اور ملکی سطح پر جو تصادم ہندو اور مسلمان کے درمیان اُبھر رہا تھا، وہی داخلی طور پر مسلمانوں کے مختلف طبقات کے درمیان بھی فروغ پانے لگا۔ سرسید نے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے زندگی کے متذکرہ بالا تین زاویوں کو اہمیت دی اور یوں ایک مکمل شخصیت کو وجود میں لانے کے لیے علی گڑھ تحریک سے اساسی نوعیت کا کام لیا۔

ہندوستان میں انگریزوں کا یہ رویہ ایک دُور رس پالیسی کا مظہر تھا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے جب تاریکی کو روشنی میں تبدیل کیا، تو مغرب نے اس روشنی سے پوری دنیا کو تسخیر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور اس کا آغاز صلیبی جو یا نہ انداز میں ہوا تھا۔ نائن بی نے لکھا ہے کہ ''افریقہ اور ایشیا کے ممالک میں مبلغوں اور فوجیوں کی آمد پندرھویں صدی میں شروع ہو گئی تھی۔ روس پر اس قسم کا حملہ سترھویں صدی میں اور آخری حملہ دوسری جنگ عظیم کے دوران کیا گیا''۔ (۸) برعظیم امریکہ اور آسٹریلیا کی دریافت اور اس پر تسلط اس یلغار کا نتیجہ تھا۔ اس یلغار کو روکنے کے لیے چونکہ نئے ہتھیاروں کا استعمال لازمی تھا، اس لیے جس ملک میں مغربی اثرات نے پیش قدمی کی وہاں تقاضائے وقت کے مطابق ایسے رہنماؤں کا ظہور ہوا جنھوں نے قومی تحفظ، مدافعت اور بقا کے لیے مغربی طریقہ ہائے جنگ کو قبول کرنے سے گریز نہ کیا۔ ترکی میں کمال اتاترک، مصر میں محمد علی پاشا، ہندوستان میں راجہ رام موہن رائے اور سرسید احمد خاں ایسے ہی مصلحین میں شمار ہوتے ہیں۔ جنھوں نے مغربی اندازِ فکر، علوم اور فنون کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور اپنے ملک کی تہذیبی شخصیت کو انتشار سے بچانے کے لیے مغرب کے وضع کردہ وسائل استعمال کیے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے انگریزوں کی حکومت کو تو تسلیم کر لیا لیکن ان کو ہندوستانی قوم کے طور پر کبھی قبول نہیں کیا۔ ان کی رائے میں ہندوستان میں مسلمان اور ہندو، صرف دو قومیں آباد تھیں۔ ان میں سے اول الذکر کے ہاتھ سے اقتدار چھن چکا تھا اور اب یہ قوم جمود اور اضمحلال کی زد میں تھی۔ موخر الذکر قوم نے

مسلمانوں کی غلامی کا قلادہ اتار کر نئے بدیسی حاکموں سے مفاہمت کی راہ اختیار کر لی تھی اور حکومت کے کارخانے میں اہم خدمات سرانجام دینے کے لیے آمادہ و مستعد تھی۔ اس حالت کی تصویر ہنٹر یوں مرتب کرتا ہے:

''تعلیم یافتہ مسلمان جن کو پرانے طریقہ تعلیم پر ناز ہے، حکومت کے ان عہدوں اور ملازمتوں پر جگہ نہیں پاتے جن پر اس سے بیشتر ان کی اجارہ داری قائم تھی۔ وہ حیران ہیں کہ یہ سب کچھ اور دیگر ذرائع زندگی قابلِ نفرت ہندوؤں کے ہاتھ میں چلے گئے یا چلے جا رہے ہیں''۔(۹)

علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کی اس پسماندگی کو سیاسی انداز میں دور کرنے کی کوشش کی اور مدرسۃ العلوم کے ذریعے ان کی بصیرت کو بدرجہ اتم بڑھایا۔ اخبار ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے ذہنی انقلاب کی راہ ہموار کی اور تراجم کے ذریعے ان علمی خزانوں کو مسلمانوں کے گھروں میں پھیلا دیا جو پہلے یورپ کے کتب خانوں میں مدفون تھے اور جن تک مسلمانوں کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک کا سیاسی زاویہ نہ صرف متحرک نظر آتا ہے بلکہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور تمدنی زندگی میں بھی انقلاب بپا کیا اور ایک جداگانہ قوم کا احساس پیدا کر کے سیاسی کامیابیوں کی راہ ہموار کی۔ علی گڑھ تحریک کا دوسرا اہم زاویہ مذہبی نوعیت کا ہے۔ سرسید نے مذہب کا خول توڑنے کے بجائے اسے فعال بنانے کی کوشش کی۔ اس لحاظ سے سرسید نے مذہب کی قوت سے بھی کام لینے کی کوشش کی۔ ایک ایسے زمانے میں جب مذہب کے روایتی تصور نے ذہن کو زنگ آلود کر دیا تھا، سرسید نے عقلِ سلیم کے ذریعے اسلام کی مدافعت کی اپنی سی کوشش کی اور ثابت کیا کہ اسلام زمانے کے نئے تقاضوں کو نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ نئے حقائق کی عقلی توضیح کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ سرسید کے زمانے میں اسلام کا اجتماعی نصب العین اور اخلاقی مقاصد پسِ پردہ چلے گئے تھے۔ مذہب صرف حصولِ ثواب کا وسیلہ بن گیا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس جمود کو توڑنے کی کوشش کی تھی۔ تاہم اس تحریک کا سیاسی زاویہ وسائل کی کمی اور سازشوں کی بنا پر کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ علی گڑھ تحریک نے اس نکتے کو واضح کیا کہ انگریزی تعلیم اسلام کے بنیادی نظریات پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ فقہ اور فلسفہ کے ساتھ ساتھ اس تحریک نے اسلام کی تفہیم میں عقلی نقطۂ نظر بھی استعمال کیا اور اس کی حقانیت کو ایک نیا ثبوت فراہم کیا۔

سرسید کی پرورش مذہبی رواداری کے ماحول میں ہوئی تھی۔ دینیات کے موضوع پر اُن کے ابتدائی رسائل میں کٹر راسخ العقیدگی پائی جاتی ہے، تاہم رفتہ رفتہ عالمانہ تحقیق کے ذوق و شوق اور تقلید کی راہ پر نہ چلنے کے احساس نے پرورش پائی۔ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو ان کے اس عالمانہ رویے کی پرورش محمد اسماعیل شہید کے زیرِ اثر ہوئی۔ اُن کی ابتدائی روایتی اسلامی تعلیم بوجوہ ادھوری رہ گئی تھی۔ اسی طرح وہ نئے طرزِ تعلیم سے بھی مستفید نہ ہو سکے، کیونکہ اُن کا انگریزی زبان کا علم محدود اور ناکافی تھا۔ اُن کی یہ ذہنی حالت مولانا حالی کی رائے میں زحمت کے پردے میں رحمت ثابت ہوئی۔ اگر سرسید پرانی، روایتی تعلیم پر کامل عبور حاصل کر لیتے تو اُن کے لیے

تقلید سے آزاد ہونا اور نئی تعلیم سے ہم آہنگ ہونا ممکن نہ رہتا۔اس کے برعکس یورپ کی ثقافتی ترقی کا اعلیٰ معیار، جو عام طور پر ہندوستانی طلبہ پر اتنا گہرا اثر ڈالتا تھا کہ وہ اپنے وطن کی ترقی کے بارے میں پُرامید ہو جاتے تھے، سرسیّد کے دماغ پر اس قدر گہرا اور حیرت انگیز اثر اس لیے ڈال سکا کہ وہ نئی اور جدید تعلیم سے بس واجبی واقفیت رکھتے تھے۔(۱۰)

اسلام کی تفسیر نو سے اُن کا بڑا مقصد وقت اور مصلحت کے تقاضے کے مطابق ضروری باتوں کی شناخت اور تعلیم تھی۔اُن کی رائے میں مسلمان اور عیسائی ایسے دو مذاہب کے پیروکار تھے جو ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ دوست تھے۔وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جدید سائنسی علوم کی تحصیل، جو اُن کی قوم کے لیے ضروری تھی اسلام اور دنیائے اسلام کے بنیادی اتحاد و استحکام کے لیے ایک خطرہ ہے تا وقتیکہ اسلامی دینیات کے مبادیات کو روایت کے بجائے عقل کے اصول پر اُستوار نہ کیا جائے۔نیز اُن کا مقصد عیسائی مشنریوں کے حملوں سے اسلام کا دفاع بھی تھا، جو اپنے تبلیغی دوروں میں یہ دعوی کرتے رہتے تھے کہ اسلام ایک غیر عقلی مذہب ہے اور ثقافتی ترقی کا مخالف ہے۔سرسیّد نے مذہب کی صداقت کے لیے عقل انسانی اور قانون فطرت کو معیار قرار دیا۔اسلام کی حرکی قوت کو ظاہر کیا اور مذہبی عقائد کو اتنی پختگی عطا کی کہ وہ مغربی علوم کے ریلے میں بہہ نہ جائیں۔اس زاویے سے دیکھیں تو بقول ڈاکٹر انور سدید 'علی گڑھ تحریک نے اسلام کو داخلی اور خارجی خطروں سے تحفظ عطا کیا اور ہندوستان کی مٹی نے رسوم، توہمات کی صورت میں جو منفی اثرات ثبت کیے تھے، ان کا قلع قمع کرنے کی سعی کی۔(۱۱)

سرسیّد نے واضح طور پر لکھا کہ ازمنہ وسطیٰ کے دوران جب مسلمانوں کا یونانی سائنسی علوم سے آمنا سامنا ہوا تو انھوں نے اپنی مکتبی دینیات کو یونانی سائنسی علوم سے ہم آہنگ کر لیا۔''نئے علم'' کو اپنے قدیم علم میں جذب کر لینے کا یہ طریقہ مفید ثابت ہوا لیکن صرف کچھ مدت کے لیے، کیونکہ اس وقت یہ احساس نہیں کیا گیا تھا کہ یونانی سائنسی علوم کی فکری و قیاسی نوعیت بالآخر مسلمانوں کو گمراہی کی طرف لے جائے گی۔یونانی سائنسی علوم کے برعکس، جدید سائنسی علوم تجربی ہیں اور تشکیک کی طرف لے جاتے ہیں۔لہٰذا ایک نئے علم الکلام کی ضرورت ہے جو جدید سائنس سے پیدا شدہ لامذہبیت کے رُجحان کے آگے بند باندھ سکے۔اگر دینیات کی تفسیر و تشریح جدید سائنس کی روشنی میں کی جائے تو سرسیّد کو یقین تھا کہ اسلام پر مسلمانوں کا ایمان پختہ تر ہو جائے گا، اس لیے اسلام اُن کی رائے میں دین فطرت ہے۔قرآنی آیات و احکام جدید سائنس کے انکشافات کے عین مطابق ہیں۔ دینیات میں ان کی تحقیقات، رویّے میں تبدیلی کی غماز ہیں، اسلام کے بنیادی اصولوں میں تبدیلی کی غماز نہیں ہیں۔اُن کے اپنے افکار و نظریات میں کوئی خاص انقلابی بات نہ تھی، کیونکہ انھوں نے جو کچھ کہا، پچھلے زمانے کے اسلام کے مشہور و معروف علمائے دین کے منتخب افکار و نظریات کی بنیاد پر کہا ہے۔(۱۲)

سرسیدؔ کی اسلام کی تشریحات عقلی تھیں، اس لیے کہ وہ مذہب سے متعلق معاملات میں تحقیق چاہتے تھے اور تقلید کے سخت مخالف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں میں بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تحقیق کی رُوح قائم رہی اسلام کا دنیاوی سائنسی علوم سے کوئی تصادم نہیں ہوا۔ جب اس روح کا فقدان ہوا تو معمولی قابلیت کے آدمی اُبھر آئے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے کہ پچھلوں نے فکر کے جو سانچے یا عمل کے جو ضوابط بنا دیے تھے، اُن پر آنکھیں میچ کر چلتے رہیں۔ صہیونی اور مسیحی افکار، نیز مقامی رسوم و رواج اسلامی دینیات میں داخل ہو گئے، یہاں تک کہ بعد کے علمائے دین نے یہ افسانہ گھڑنے میں فخر محسوس کیا کہ اجتہاد (آزادانہ تحقیق) کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ خدا کی نوعیت و ماہیت کے بارے میں انھوں نے جو دلائل پیش کیے وہ کائناتی اور غایتیاتی تھے۔ خدا علت نمائی کی حیثیت سے انسانی فہم و ادراک سے ماورا ہے۔ خدا ''قدرت'' کا خالق اور صانع ہے۔ پس اسی لیے ''قدرت'' مکمل تھی (یعنی دنیا کو سموس (Cosmos) ہے، ایک مرتب، باقاعدہ کل، باضابطہ وحدت) جو چیز قدرت کے مطابق اور اس سے ہم آہنگ ہے، وہ قدرتی ہے اور جو چیز اس سے ہم آہنگ نہیں، وہ غیر قدرتی ہے۔ (۱۳)

اسلام انسانی نیچر کے عین مطابق ہے کیونکہ جدید سائنسی علوم نے نیچر کی تشریح کی ہے، انسانی نیچر اُس کے عین مطابق ہے۔ قرآن خدا کا قول ہے اور نیچر خدا کا عمل۔ خدا کے قول و عمل میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ (۱۴)

سرسیدؔ نے اسلام کے ''اساسی اصولوں'' (جن کو قرآن احکام منصوصہ کہتا ہے) اور ''استخراجی اصولوں'' کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا ہے۔ اساسی اصول نیچر کے عین مطابق ہیں اور استخراجی اصول یا تو سابقہ فقہا کی ذاتی رائے ہیں یا اجماع کا اتفاقِ رائے۔ (۱۵) احادیث کے استناد کے لیے، خواہ اُن کے راوی کتنے بھی قابلِ اعتبار ہوں، سرسید نے انتہائی سخت منطقی کسوٹی اور ایک لازمی شرط مقرر کر دی۔ مثال کے طور پر جو احادیث قرآن سے متصادم ہیں وہ غیر معتبر ہیں۔ انھوں نے وحی متلو اور غیر متلو میں بھی امتیاز رکھا۔ وحی متلو سے مراد وہ وحی ہے جو تلاوت کی جاتی ہے اور یہ قرآن کریم ہے۔ وحی غیر متلو سے مراد وہ وحی ہے جس کی قرآن کی طرح تلاوت نہیں کی جاتی بلکہ صرف پڑھی جاتی ہے اور اس سے مُراد احادیث ہیں۔ آنحضورﷺ کی احادیث یا ذاتی آرا مستند ہوں یا نہ ہوں قوتِ نافذہ کی حیثیت نہیں رکھتیں کیونکہ حضورﷺ نے کبھی اپنے بارے میں فوق البشر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مختصراً یہ کہ سرسید احمد خان کی رائے میں قرآن مجید میں درج ''احکام منصوصہ'' کے علاوہ تمام اسلامی دینی لٹریچر کو اسلام کی کسی بھی اچھی تفسیر میں ثانوی کردار ہی ادا کرنا چاہیے۔ (۱۶)

عملاً سرسیدؔ کی بعد کی تمام تحریروں میں اسلام کی تفسیروں سے دیومالائی عناصر خارج کر کے، اُن کو عقل کی بنیاد پر لانے کی شعوری کوشش صاف نظر آتی ہے۔ یہ شعوری کوشش تجرباتی سائنسوں کے نتائج کے عین مطابق

تھی ۔اُن کی ''تفسیر القرآن'' عین اسی اصول کے مطابق تھی، جو ان شکوک وشبہات کو رفع کرنے کے لیے لکھی گئی تھی جو مغربی تعلیم کی اشاعت سے مسلم اربابِ فکر ودانش کے ذہنوں میں پیدا ہو گئے تھے۔

نبوت کو خُلقی وصف قرار دیا گیا۔ جوں جوں نبیؐ عمر میں تجربے میں پختہ ہوتا جاتا ہے، نبوت کا وصف بھی بڑھتا جاتا ہے۔ حضرت محمدؐ اُمی تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کی ذاتِ اقدس کو اپنا وسیلہ اظہار بنانا چاہتا تھا، جس کے ذریعے اُس کے لفظ (یعنی قرآن) کا ابلاغ ہو سکے۔ آنحضورؐ کے معجزوں، حیات بعد الموت، جنت اور دوزخ کے واردات اور یوم حشر سب کی تفسیر عقلی طور پر کی گئی۔ شیطان اور فرشتوں کے خارجی وجود سے انکار کیا گیا۔(۱۷) سات منجمد ومجسم افلاک، زمین کے گرد سورج کی گردش جیسے مکتبی مفروضات کا بطلان کیا گیا اور بتایا گیا کہ قرآن نے کائنات کے بارے میں جدید سائنس کے انکشافات ونتائج کی تصدیق کی ہے۔(۱۸) حضرت آدمؑ کے روایتی قصہ کو مسترد کر دیا گیا اور نظریہ ارتقا کو قرآن سے مکمل ہم آہنگ ومطابق قرار دے کر قبول کر لیا گیا۔(۱۹) اسی طرح آنحضورؐ کی بدنی معراج اور شق صدر کو مسترد کر دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ تجربات محض تصور یا خواب تھے۔(۲۰) مسلمان جب تک توحید اور رسالت پر ایمان رکھتا ہے، اُس کا کوئی عمل اُسے کافر نہیں بنا سکتا کیونکہ ایمان ایک ایسی چیز ہے جو قلب میں ہوتا ہے۔ اسلام نے عورت کا مقام ومرتبہ بڑھایا ہے۔ لہٰذا کثرتِ ازدواج کا جو مطلب مسلمانوں نے سمجھ رکھا ہے، اسلام نے اُس کی اجازت نہیں دی۔(۲۱) اسی طرح غلامی بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، جس نے انسدادِ غلامی پر زور دیا ہے۔

سرسیدؔ کا مقصد، جیسا کہ انھوں نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے، مسلمانوں کی اجتماعی ترقی تھا اور یہ مقصد مذہب کو شامل کیے بغیر حاصل کرنا ممکن نہ تھا، لہٰذا انھوں نے محسوس کیا کہ اسلام کی نئی تفسیر ہونی چاہیے لیکن وہ اس معاملے میں بہت دُور نکل گئے جس کی وجہ سے اُن کی مذہبی تحریک بے جان رہی، کیونکہ یہ منفی نوعیت کی تھی۔ اس کی طاقت اس میں پنہاں تھی کہ جس بات کی تائید نہ کی جا سکتی ہو، اُس سے انکاری ہو جاؤ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مذہبی تحریک ایک طرح کی معاشرتی اور سیاسی تحریک میں ضم ہو گئی۔ بالجونؔ (Baljoon) نے لکھا ہے:

> ''مذہب پر احمد خانؔ کے نظریوں کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں کہ انیسویں صدی کی مغربی فکر کے لاڈلے بچے یعنی 'عقل' کو پیار سے تھپکنا اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے دل بہلانا۔''(۲۲)

سمتھؔ لکھتا ہے کہ ''بڑی حد تک اسلام میں جدیدیت ظاہری صورت میں مسیحی مشنریوں کے جارحانہ حملوں کے ردِعمل میں وجود میں آئی۔ تقریباً بلا استثنا، مصلحین نے نئے، جدید اسلام کی تشریح میں جو کچھ بھی لکھا، مشنریوں کی اسلام پر سخت نکتہ چینی کے جواب میں معذرت خواہانہ انداز میں لکھا۔ فی الحقیقت عیسائی مشنریوں کے حملے کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ اسلام انسان دوستی اور لبرل اصول پرستی کا وہ معیار قائم کرنے سے قاصر ہے جو مغربی بورژوا کلچر نے قائم کیا تھا (اور مغربی عیسائیت نے جسے اپنے اندر جذب کر لینا تھا)۔۔۔ ہندوستانی بورژوا

(سید احمد خان اور دوسروں) نے مشنریوں کے حملے کا نکتہ سمجھا۔۔۔ ردعمل کے طور پر جو اسلام پیش کیا، اُس کے بارے میں عیسائی مصنفین نے لکھا، کہ یہ تو زیادہ عیسائیت پر مبنی ہے۔ مسلم کسان نے بھی سرسید کا پیدا کردہ بورژوا اسلام قبول نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے بالائی اور متوسط طبقوں میں سرسید کے مذہبی خیالات کی سخت مخالفت ہوئی۔ اُن کے تعلیمی منصوبے میں اس شُبہے کے تحت رکاوٹ پیدا ہوئی کہ اُن کے مذہبی خیالات بالآخر تعلیمی نصاب میں شامل کر لیے جائیں گے۔ چنانچہ مکہ معظّمہ کے فقہا سے اُن کے کافر ہونے کے فتوے حاصل کیے گئے۔ اُن کو دجال کہہ کر ملامت کی گئی اور دہریہ کہہ کر تمسخر اڑایا گیا۔ حتّٰی کہ اُن کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا لیکن سرسید نے اپنے خیالات میں ذرا بھی تبدیلی نہ کی۔" (۲۳)

علی گڑھ تحریک کا تیسرا فعّال زاویہ ادبی ہے اور اس کے تحت نہ صرف اردو زبان کو وسعت ملی بلکہ اردو ادب کے اسالیبِ بیان اور روحِ معانی بھی متاثر ہوئی اور اس کے موضوعات کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کے مایۂ خمیر میں پراکرت اور اپ بھرنش وغیرہ نے بھی اساسی کردار ادا کیا تھا تاہم اس کی ادبی ساخت کو مسلمانوں کے تہذیبی اثرات اور عربی و فارسی کے عناصر نے ایک لسانیاتی انقلاب سے دوچار کر دیا تھا۔ (۲۴) علی گڑھ تحریک نے نہ صرف ہندی زبان کے غلبے کو روکنے کی کوشش کی بلکہ اس نے لفظ کی داخلی حرکی قوت کو پہچانا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ و تہذیب الاخلاق کے ذریعے سے اس قوت کو مثبت طور پر استعمال کیا۔ اٹھارویں صدی جس میں ولی دکنی نے اردو غزل کی ایک توانا تحریک کو فروغ دیا تھا، شاعری کی صدی تھی اور اس میں شاہ حاتم، سودا، میر درد اور میر تقی میر جیسے قد آور شعرا پیدا ہوئے۔ تاہم نثری ادب تصوف کے رسائل تک محدود تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی افسانوی نثر نے ایک نئی راہ دریافت کی۔ دہلی کالج کی فنی اور مرزا غالب کی نجی نثر نے اسے ترقی کا کھلا راستہ دکھایا۔ غالب ہمیں اپنی نثر کی ذاتی جمالیات میں تو شریک کر لیتا ہے لیکن وہ نثر کی کسی تحریک کا نقطۂ آغاز نہیں بنتا۔ علی گڑھ تحریک نے چونکہ قومی مقاصد کو پروان چڑھانے کا عہد کیا تھا اور اس کا روئے سخن خواص سے کہیں زیادہ عوام کی طرف تھا، اس لیے صرف شاعری اس تحریک کی ضروریات کی کفیل نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ادبی سطح پر علی گڑھ تحریک نے اردو نثر کا ایک باوقار سنجیدہ اور متوازن معیار قائم کیا اور اسے شاعری کے مقفّٰی اور مسجّع اسلوب سے نجات دلا کر سادگی اور متانت کی کشادہ ڈگر پر ڈال دیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ادبیاتِ اردو پر سرسید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "سرسید نے اردو ادب کو جو ذہن دیا، اس کے عناصرِ ترکیبی کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے بڑے بڑے عنوان ہونگے، مادیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری۔ سرسید کے مجموعی فکر و ادب کی عمارت انہی بنیادوں پر قائم ہے اور شاید یہی وہ نمایاں اور اہم رجحانات ہیں جو اردو ادبیات میں سرسید کا فیضِ خاص سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان رجحانات سے اردو کا سارا ادب ان

کے زمانے میں متاثر ہوا اور ایک معمولی سے ردِعمل سے قطع نظر آج کا مجموعی ادبی اور فکری رجحانات بھی اُسی سلسلہ فکر و عمل کی ارتقائی شکل ہے۔ چنانچہ جدید ترین زمانے کی ترقی پسند تحریک اپنی بیشتر خصوصیات کے لحاظ سے سرسید کی مادیت، عقلیت اور حقائق نگاری ہی کی ہم جنس اور اس کی ترقی یافتہ صورت معلوم ہوتی ہے۔"(۲۵)

علی گڑھ تحریک نے سائنسی نقطہ نظر اور اظہار کی صداقت کو اہمیت دی تھی۔ اس کا سب سے زیادہ اثر سوانح اور سیرت نگاری کی صنف پر پڑا۔ اٹھارویں صدی میں عیسائی مبلغین نے رسول اسلامؐ اور دیگر نامور مسلمانوں کے غلط سوانح شائع کر کے اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی تھی اور اس میں کبھی کبھی ہندو مورخ بھی شامل ہو جاتے تھے۔ علی گڑھ تحریک چونکہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کو فروغ دے رہی تھی اس لیے اس نے اسلام اور داعی اسلامؐ کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کی۔ سرسیدؔ کی 'خطبات احمدیہ' مولوی چراغ علیؔ کے 'رسائل' اور نذیر احمد دہلویؔ کی کتاب "امہات الامہ" میں تاریخی صداقتوں کو پیش کیا گیا۔ شبلی نعمانیؔ نے نامورانِ اسلام کو سوانح نگاری کا موضوع بنایا اور ان کی زندگی اور کارناموں کو تاریخ کے سچے تناظر میں پیش کر کے عامۃ الناس کو اسلام کی مثالی شخصیتوں سے روشناس کرایا۔ حالیؔ نے اپنے عہد کی عظیم شخصیات کا سوانحی خاکہ مرتب کیا۔ ان کی کتاب 'حیات سعدی' اسلاف کے کارناموں کو ابھارنے اور احیائے قومی کو بروئے کار لانے میں معاونت کرتی ہے۔

علی گڑھ تحریک نے قومی زندگی میں جو ولولہ پیدا کیا تھا اسے بیدار رکھنے کے لیے ملّی تاریخ سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ سوانح نگاری سے جو قوت انفرادی سطح پر حاصل کی گئی تھی، تاریخ نگاری میں وہی قوت اجتماعی سطح پر اخذ کی گئی۔ دونوں صورتوں میں قوت کا خزینہ ماضی سے تلاش کیا گیا لیکن ارتقا کی جہت کو مستقبل کی طرف لپکنے پر مائل کیا گیا۔ چنانچہ اس تحریک نے تاریخ کو سپاٹ بیانیہ نہیں بنایا بلکہ اس فلسفے کو جنم دیا کہ تاریخ کے اوراق میں قوم اور معاشرے کا دھڑکتا ہوا دل محفوظ ہوتا ہے، جس کا آہنگ دریافت کر لینے سے مستقبل سنوارا اور ارتقا کے تسلسل کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔(۲۶) اسی نقطہ نظر سے سرسیدؔ نے آئینِ اکبری، تزکِ جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہ دوبارہ مرتب کیں۔ شبلیؔ نے سیرت النبیؐ، الفاروق، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، لکھیں اور مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ ہندوستان، تالیف کی۔ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کے شاندار ماضی کی قصیدہ خوانی نہیں کی اور نہ ہی اسلاف کی عظمت سے قوم کو مسحور کیا۔ چنانچہ اس تحریک نے تاریخ کے بُرے پھل سے عوام کو بچانے کی کوشش کی اور ماضی کے تذکرہ جمیل سے صرف اتنی توانائی حاصل کی کہ قوم مستقبل کی مایوسی کو ختم کرنے کے لیے ایک معیار مقرر کر سکے۔ علی گڑھ تحریک نے تاریخ نگاری کے لیے ایک الگ زبان بھی وضع کی۔

نسیم قریشی سرسیّد کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''ہر فن کے لئے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہے۔تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت وبلاغت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔''(۲۷)

چنانچہ علی گڑھ تحریک نے غیر شخصی اسلوب کو مروّج کیا اور اسے غیر جانبداری سے تاریخ نگاری میں استعمال کیا۔

علی گڑھ تحریک نے زندگی کے جمال کو اجاگر کرنے کے بجائے مادّی قدروں کو اہمیت دی۔ چنانچہ ادب کو بے غرض مسرت کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے ایک ایسا مفید وسیلہ قرار دیا گیا جو مادی زندگی کو بدلنے اور اسے مائل بہ ارتقا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ادب کا یہ افادی پہلو بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا، تاہم یہ اعزاز علی گڑھ تحریک کو حاصل ہے کہ اردو زبان کے دورِ طفولیت میں ہی اس کی عملی حیثیت کو اس تحریک نے قبول کیا اور ادب کو عین زندگی بنا دیا۔اس لحاظ سے سرسیّد بقول ڈاکٹر سید عبداللہ، سب سے پہلے ترقی پسند ادیب اور نقاد تھے،(۲۸) سرسیّد کے شعورِ فن کی پہلی کرن بیدار ہوئی تو انھوں نے ادب کو بھی زندگی کے مماثل قرار دیا اور اس پر نظری اور عملی زاویوں سے تنقید کی۔چنانچہ سرسیّد نے تنقید کی کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی، تاہم ان کے رفقا میں حالؔی نے 'مقدمہ شعر وشاعری'، لکھ کر علی گڑھ تحریک کو 'بوطیقا' مہیا کر دی اور اس کا عملی اطلاق 'یادگار غالب' میں کیا۔شبلؔی کے تنقیدی نظریات ان کی متعدد کتابوں میں موجود ہیں اور ان نظریات کی عملی تقلید ''شعر العجم'' ہے۔ علی گڑھ تحریک نے تنقید کے جس نظریے کو فروغ دیا اس میں طرز ادا کے بجائے مرکزی موضوع اور بنیادی مضمون کو اہمیت حاصل ہے۔مقصد یہ تھا کہ ادیب جو کچھ سوچتا ہے اس کا اساسی مفہوم الفاظ کی شوکت اور بیان کی جلالت میں گم ہو جانے کے بجائے قاری تک صحیح اور صادق صورت میں منتقل ہو جائے۔سرسیّد اس نکتے کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفّٰی عبارت کہلاتی تھی، ہاتھ اٹھایا۔جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ دی۔اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ مضمون کی ادا میں ہو۔جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے''۔(۲۹)

ظاہر ہوا کہ سرسیّد نے ادیب اور اس کی تخلیق کو ہی اہمیت نہ دی بلکہ قاری کی اساسی حیثیت کو بھی تسلیم کیا ہے اور یوں مصنف، تخلیق اور قاری کی ایک اہم رشتہ تثلیث قائم کر دی۔

علی گڑھ تحریک کے تصنیفی کام پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ ادب یبوست زدہ نظر نہیں آتا بلکہ عقلی دلیل کے ساتھ اسلوب کی جمالیاتی کیفیت بھی نمایاں نظر آتی ہے۔سرسیّد نے لکھا:

''ہماری زبان کے علم وادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی شاعروں نے اپنی ہمت

عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔"(۳۰)

چنانچہ سرسید نے غزل کی ریزہ خیالی کے برعکس نظم رائج کرنے کی سعی کی اور اس کے فروغ میں سرسید کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حالی سے 'مسدس مدّ وجزر اسلام' لکھوائی اور پھر اسے اپنے اعمالِ حسنہ میں شمار کیا۔سرسید کی جدیدیت نے اس حقیقت کو بھی پا لیا تھا کہ ردیف اور قافیہ کی پابندی خیالات کے خطری بہاؤ میں رکاوٹ ہے۔چنانچہ انھوں نے بے قافیہ نظم کی تخلیق پر زور دیا اور لکھا :

"ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذاتِ شعر میں داخل تھی۔رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج نہیں تھا۔اور اب بھی شروع نہیں ہوا ان باتوں کے نہ ہونے سے ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی"۔(۳۱)

سرسید کے ان نظریات کا اثر یہ ہوا کہ اردو نظم میں نظریات نگاری کی ایک موثر تحریک پیدا ہوگئی۔نظم جدید کے تشکیلی دور میں علی گڑھ تحریک کے رفیق عبدالحلیم شرر نے سرگرم حصہ لیا اور رسالہ "دلگداز" میں متعدد ایسی نظمیں شائع کیں جن میں مروجہ جامد قواعد وضوابط سے انحراف برت کر تخلیقی رو کو اظہار کی آزادی عطا کی گئی تھی۔

علی گڑھ تحریک کا ایک اور اہم کارنامہ اردو مضمون نویسی کا فروغ ہے اور اس کے اولین نمونے بھی اس تحریک نے ہی فراہم کیے۔سرسید نے 'تہذیب الاخلاق' کو سٹیل اور ایڈیسن کے رسائل "سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر" کے انداز میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ان کے مضامین کی برجستگی، غیر رسمی انداز، ڈھیلے ڈھالے اسلوب اور لطافت و شائستگی کے سرسید بے حد مداح تھے۔چنانچہ تہذیب الاخلاق میں انھوں نے زندگی کے مسائل کو اسی فرحت بخش انداز میں پیش کرنے کی سعی کی۔اردو کا جدید انشائیہ اگرچہ واضح طور پر بیسویں صدی کے نصف ثانی میں سامنے آیا تاہم اسے سرسید کی مضمون نگاری اور مہدی افادی کی انشا نویسی سے الگ کرنا ممکن نہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علی گڑھ تحریک کا ادبی زاویہ نسبتاً زیادہ فعال اور اثر انگیز ہے۔اس تحریک کے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی زاویوں نے ہندوستان میں معرکہ بحث وجدال قائم کیا اور اختلاف فکر ونظر کا اتنا طوفان اٹھایا کہ بعض اوقات سرسید کی ساری شخصیت خاک آلود نظر آتی ہے۔تاہم اس تحریک کا ادبی زاویہ اتنا مضبوط اور موثر ہے کہ بیسویں صدی میں جدیدیت کی جتنی تحریکیں اٹھیں ان سب کا سرچشمہ علی گڑھ تحریک کا ادبی زاویہ ہے۔علی گڑھ تحریک سرسید احمد خان کا خواب زرّیں تھا اور اور اس خواب کی تعبیر میں جن لوگوں نے نسل بعد نسل کام کیا ان کی فہرست بہت طویل ہے۔چنانچہ شیخ محمد اکرم کا یہ خیال محلِ نظر ہے کہ علی گڑھ نے نہ تو کوئی شبلی، حالی پیدا کیا اور نہ کوئی قابل ذکر علمی روایت پیدا کی۔(۳۲) حقیقت یہ ہے کہ کسی نابغہ کی پیدائش منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ اس کا ظہور تاریخی ضرورت ہوتی ہے۔سرسید تاریخ کے ایک ایسے

موڑ پر پیدا ہوئے جب مسلمان زوال کی انتہائی پستی تک پہنچ گئے تھے۔سرسیّد نے نہ صرف اس زوال کو روکا بلکہ مسلمانوں کو اجتماعی اعتماد عطا کر کے انھیں مستقبل پر اثر انداز ہونے کا سبق دیا۔علی گڑھ تحریک ایک اجتماعی تحریک تھی۔اجتماعی سطح پر علی گڑھ تحریک نے نہ صرف مستحکم روایات پیدا کیں بلکہ ایک طرزِ حیات اور اندازِ فکر کو بھی جنم دیا اور معاشرت، سیاست اور ادب کے بہت سے زاویوں کو صحت مند انداز میں متاثر کیا۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''علی گڑھ تحریک اردو کی اوّلین فکری تحریک تھی۔اس تحریک سے پہلے زبان کی ظاہری ہیئتوں پر توجہ صرف کی تھی۔اردو زبان کا استخوان ہندوستانی لیکن مغز ایرانی تھا۔اس تحریک نے ان دونوں میں جسم اور روح کا رشتہ قائم کیا اور لفظ کے حُسن کو اجاگر کرنے کے بجائے روح اور معنی کو اہمیت دی۔سرسیّد سے پہلے اردو کا بیشتر تخلیقی ادب صرف شاعری کی اصناف کا احاطہ کرتا تھا۔علی گڑھ تحریک نے نثر کی اصناف کو فروغ دیا۔سرسیّد نے چونکہ افکار اور نظریات کے مغربی خزینوں کو بھی کھنگالا تھا اس لیے اس تحریک نے مشرق اور مغرب کے فکری انضمام سے اردو ادب کو مغرب کا ہم پلّہ بنانے کی سعی کی۔اس زاویے سے دیکھیے تو علی گڑھ تحریک کے ادب کی ایک جہت مستقبل کی طرف لپکتی ہوئی نظر آتی ہے۔تاہم اس جہت کو رومانی قرار دینا اس لئے ممکن نہیں کہ اس تحریک میں جذبے کی اڑان خاصی کمزور ہے۔۔۔ چنانچہ اس تحریک نے کلاسیکی اندازِ عمل بھی پوری طرح اختیار نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کو جس قوم سے واسطہ تھا وہ شدّت سے ماضی پسند تھی۔سرسیّد ایک نظر مستقبل کی طرف دیکھتے تو دوسری نظر ماضی پر بھی ڈال لیتے۔یوں انہوں نے نوجوان مستقبل اور بوڑھے ماضی کو بیک وقت ہم قدم رکھنے کی کوشش کی۔چنانچہ علی گڑھ تحریک نہ پوری کلاسیکی تھی اور نہ رومانی بلکہ اسے نو کلاسیکی، نو رومانی عناصر کی امتزاجی تحریک قرار دیا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔''(۳۳)

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) اردو ادب کی تحریکیں، ابتدا تا ۱۹۷۵ء، از ڈاکٹر انور سدید۔ص ۲۶۰۔کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۸ء

(۲) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے ۲۰۱۰ء تک)، از ڈاکٹر سلیم اختر۔۳۲۲۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۲۰۱۴ء

(۳) سرسید کا خواب، از صلاح الدین احمد۔ص ۲۴۔۲۳، مکتبہ جامع لمٹیڈ، جامع نگر، نئی دہلی۔۱۹۹۵ء

(۴) حیات جاوید از الطاف حسین حالی۔ص ۱۸۸۔ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔۱۹۹۰ء

(۵) علی گڑھ تحریک کے سیاسی پہلو، مرتب، نسیم قریشی ۔ص ۳۹، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۔۲۰۰۷ء

(٦) اردو ادب کی تحریکیں، ابتدا تا ۱۹۷۵ء، از ڈاکٹر انور سدید ۔ص ۳۰۸ ۔کتابی دنیا، دہلی ،۲۰۰۸ء

(۷) ایضاً ۔ص ۳۰۹

(۸) The World and The West, pg. ,Oxford University Press,1953

(۹) ہمارے ہندوستانی مسلمان، ترجمہ، صادق حسین ۔ص ۲۱٦، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔۱۹۹۰ء

(۱۰) حیات جاوید، حصہ دوم ۔ص ۴، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۔۱۹۹۱ء

(۱۱) اردو ادب کی تحریکیں، ابتدا تا ۱۹۷۵ء ۔ص ۳۱۳ ۔کتابی دنیا، دہلی ،۲۰۰۸ء

(۱۲) اسلام اور پاکستانی تشخص از ڈاکٹر جاوید اقبال ۔ص ۱۷۹ ۔اقبال اکادمی، پاکستان ،۲۰۱۲ء

(۱۳) مضامین تہذیب الاخلاق، جلد دوم ۔ص ٦ ۔۳۰۲، نشاط آفسیٹ پریس، فیض آباد ۔۱۹۹۳ء

(۱۴) خطبات احمدیہ ۔ص ۲۸۲ ۔۲٦۱ ۔یونیورسٹی پبلشرز، علی گڑھ ۔۱۹۵۸ء

(۱۵) ایضاً ۔ص ٦

(۱٦) مضامین تہذیب الاخلاق، جلد دوم ۔ص ۸۰ ۔۱٦۴، نشاط آفسیٹ پریس، فیض آباد ۔۱۹۹۳ء

(۱۷) تفسیر القرآن، جلد پنجم ۔ص ۱۱۱ ۔۱۰۹، یونیورسٹی پبلشرز، علی گڑھ ۔۱۹٦۸ء

(۱۸) ایضاً، جلد دوم ۔ص ۲۸۹ ۔۲۲٦

(۱۹) ایضاً ۔ص ۱۹۴ ۔۱۸۳

(۲۰) ایضاً، جلد ششم

(۲۱) ایضاً، جلد دوم ۔ص ۹۰ ۔۷۱

(۲۲) Baljons,The Reforms and Religious Ideas, pg.85, Apex Books Concern.1970

(۲۳) Modern Islam In India, pg.45, Ripon Printing Press, 1947

(۲۴) ڈاکٹر مسعود حسین، علی گڑھ تحریک ۔مرتبہ، نسیم قریشی ۔ص ۳۵۵

(۲۵) علی گڑھ نمبر، مارچ ۱۹۵۵ء ۔ص ۵٦

(۲٦) اردو ادب کی تحریکیں ۔از ڈاکٹر انور سدید ۔ص ۳۱٦ ۔کتابی دنیا، دہلی ،۲۰۰۸ء

(۲۷) علی گڑھ تحریک ۔ص ۱۲۹۸ از نسیم قریشی ۔انجمن ترقی اردو ہند ۔نئی دہلی ۔۱۹۹۳ء

(۲۸) سرسیداوران کے نامور رفقاء کی نثر ۔ص۱۹۰۔مقتدرقومی زبان ،اسلام آباد،پاکستان ۔۱۹۸۶ء

(۲۹) مقالاتِ سرسید،مرتبہ،محمداسماعیل،حصہ دہم ۔ص۱۱۴،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی ۔۱۹۹۰ء

(۳۰) ایضاً،ص۱۲۰

(۳۱) ایضاً

(۳۲) موجِ کوثر ازشیخ محمداکرام ۔ص۱۱۱۔۱۷۳۔ادبی دنیا،مٹیا محل دہلی ۔۱۹۶۲ء

(۳۳) اردوادب کی تحریکیں،ابتداتا ۱۹۷۵ء،ازڈاکٹرانورسدید ۔ص۳۳۹۔۳۳۸۔کتابی دنیا،دہلی،۲۰۰۸ء

۞۞۞